کورس: تدریس اردو (6494) سمسٹر: خزاں، 2021ء

امتحانی مشق نمبر 1

(یونٹ 1 تا 4)

سوال 1- اردو زبان کی تدریس کے مقاصد بیان کریں۔ (20)

سوال 2- کیا مروجہ نظام تعلیم نظریہ پاکستان کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے؟ دلائل کے ساتھ بحث کریں (20)

سوال 3- ادب جمالیات کی ادب جمالیاتی ذوق کی نشوونما میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ وضاحت کریں۔ (20)

سوال 4- تدریس ادب کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ طلبہ زبان و بیان کی بہترین شکلوں سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ دلائل کے ساتھ بحث کریں۔ (20)

سوال 5- لائبریری کی ضرورت و اہمیت پر تفصیلی مضمون قلم بند کریں۔ (20)

Downloaded From Tajassus.com

ANS 01

نفاذ اردو کے لیے جوکوششیں ہو رہی ہیں، وہ اپنی جگہ لیکن خود ہمارے سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس اپنی ریٹائرمنٹ سے ایک دن پہلے یہ احکامات جاری کرچکے تھے کہ ملک میں فوری طور پر اردوکو نافذ کیا جائے مگر جہاں قانون کا کوئی احترام نہ ہو، وہاں ریٹائرڈ جسٹس کے حکم کوکون مانتا ؟ لہٰذا بہتر سال بعد بھی نفاذ اردو ایک خواب ہی خواب ہے ۔ لیکن اس کے باوجود بہت سے ادارے ذاتی طور پرکوششوں میں لگے ہوئے ہیں کہ کسی طرح پاکستان میں اس کی قومی زبان نافذ ہو جائے۔

کراچی کے چند نوجوانوں نے بھی ایجوکیٹر آف پاکستان کے تحت اردو کے نفاذ کی کوششوں میں ایک اہم قدم اٹھایا۔ کراچی آرٹس کونسل کے منظر اکبر ہال میں انھوں نے ایک سیمینار یا ورکشاپ منعقد کی جس میں بڑے بڑے اردو داں اور اساتذہ کو مدعو کیا اور اس کے علاوہ اردوکے اساتذہ جو مختلف تعلیمی اداروں میں پڑھا رہے ہیں ان کو بھی انھوں نے دعوت دی ۔ پیغام ملنے کے بعد ہم نے بھی اس میں شمولیت کے لیے رابطہ قائم کیا، تمام مراحل سے گزر کر ہمیں وہاں کا انٹری کارڈ بھی موصول ہوگیا لیکن وہاں پہنچے تو بڑی حیرت ہوئی۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ کراچی کے دوچار اسکولوں کے اساتذہ موجود ہوں گے لیکن وہاں جا کر پتہ چلا کہ حیدرآباد ، نواب شاہ اور اندرون سندھ کے علاوہ کراچی کے بھی تمام بڑے اور چھوٹے اسکولوں کے کافی اساتذہ موجود تھے، جن میں

خواتین کی تعداد زیادہ تھی جب کہ مرد ذرا کم ہی تھے۔اس تقریب کا آغاز ہوا تو مختلف ماہرین نے جو ضروری نہیں کہ وہ اردوکے استاد ہوں بلکہ سائنس ، ریاضی کے اساتذہ بھی دراصل تدریس اردو کو نافذ کرنے کے لیے مختلف مراحل اور اقدام پر اپنی طرف سے انھوں نے گفتگوکی اور بتایا، اردو کس طرح پڑھائی جائے ، اردوکو کس طرح سے نافذ کیا جائے، اردو میں بچوں کوکس طرح دلچسپی پیدا کی جائے۔

ورکشاپ دوپہر 12 بجے سے شام چھ بجے تک جاری رہی،گفتگو سن کر اور ان کے بتائے ہوئے طریقوں کو بغور سن کر بلکہ اس میں بہت سے نوٹ بھی لیے گئے لیکن نتیجے میں ہم ہمارے سامنے صرف یہ بات آئی کہ لوگوں نے اپنی اپنی لیاقت کا مظاہرہ کیا۔ اپنے اپنے موضوع پر اچھی طرح لوگوں کو سمجھا کر خطاب کیا لیکن اس ورکشاپ کا جو اصل موضوع تھا یعنی اردو وہ واحد قومی زبان ہے جس کے بولنے والوں نے اس کی سب سے زیادہ تحقیرکی ہے ، اس پرکسی نے بھی روشنی نہیں ڈالی ۔

اس کے علاوہ یہ بات واضح ہوسکے کہ آخر اگر اردو نافذ ہوجائے تو تدریس سے اردو یعنی اردو میں تمام مضامین کوکس طرح سے پڑھانے میں ابتک کہ جو آثار نہ ہی جو انگریزی میں پڑھا رہے ہیں، ان کوکیا مشق کرنی چاہیے اورکس طرح سے وہ اردو میں اپنے مضامین کو پڑھانے میں کامیاب ہوسکتے ہیں ۔

یہ سیمینار یا ورکشاپ دو حصوں پر مشتمل تھی پہلے حصے کی نظامت نازیہ صاحبہ نے بڑی عمدگی سے کی ۔ پہلے حصے میں تجربہ کار اساتذہ نے اپنے اپنے موضوعات پر تیار شدہ لیکچر پر مشتمل اپنے طالبعلمی اور تدریس کے تجربات کی روشنی میں ملک میں اردوکے ماضی اور حال پرگفتگو کی ۔ یہ خیال بھی پیش کیا گیا ، نفاذ اردو کے لیے سب سے پہلے تدریس اردو پر بھرپور توجہ کی ضرورت ہے کہ اردو بطور زبان پڑھائی جارہی ہے یا بطور مضمون ، اردو کے اساتذہ کے لیے محض اردو میں ماسٹر ڈگری کافی نہیں قرار دی جاسکتی بلکہ اردوکے اساتذہ کا تقرر کرتے ہوئے ڈگری وہ بھی درجہ اول کی بجائے تدریسی صلاحیت کو مدنظر رکھنا چاہیے یہ ضروری نہیں جو اعلیٰ درجے میں کامیاب ہو وہ اچھا استاد بھی ثابت ہوگا۔

اس حصے کو بحث و مباحثے کی بجائے سوال وجواب کا حصہ کہا جاسکتا ہے کیونکہ شمائلہ صاحبہ ایک سوال پہلے سے مقررکردہ استاد سے کرتیں اور وہ اس

Downloaded From Tajassus.com

کا جواب دینے کے بجائے لمبا چوڑا لیکچر عنایت فرماتے ہوئے طاہر جاوید جن کا تعلق علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے تھا، شمائلہ صاحبہ کے سوال کے جواب میں تقریبا چار پانچ صفحات پر مشتمل پہلے سے تیار شدہ مضمون پڑھ ڈالا، جس میں سوال کا جواب دور دور تک نہ تھا اور ہم سوچتے رہ گئے کہ جب ایسے افراد تدریس کے فوائد بتائیں گے تو نتائج کیا ہوں گے ۔اس کے بعد جامعہ کراچی کے ڈاکٹر شکیل فاروقی سے سوال کیا گیا کہ متاثر کرنے والے اساتذہ اب کہاں گئے ؟ ڈاکٹر شکیل نے سوال کے مطابق اور بڑے دل نشین انداز میں جواب دیا اور اپنے اسکول کے اردو اور انگریزی اساتذہ کے بارے میں تفصیل سے بتایا کہ ان کا انداز تدریس کیسا تھا، شخصیت، انداز گفتگو اور طلبہ سے تعلقات کی نوعیت کیا تھی ، جس کے باعث وہ کس قدر متاثرکرنے والے اساتذہ تھے ۔ ڈاکٹر شکیل کا مدلل جواب اور دلکش اندازگفتگو نے لوگوں کو بہت متاثر کیا۔ کے بعد فراز احمد نجمی اور سلمان بٹ نے بھی کیے

ANS 02

پاکستانی نظام تعلیم کا سب سے سنگین مسئلہ تعلیمی عصبیت (Education apartheid)ہے ۔امیروں اور غریبوں کے بچوں کی تعلیم میں ایک واضح تقسیم نظر آتی ہے۔ زبان اس تقسیم میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

پچھلے کئی عشروں سے نیو لبرل ماڈل ہمارے تعلیمی نظام میں رچ بس گیا ہے اور اب امیروں اور مڈل کلاس کے بچوں کے تعلیمی اداروں میں ایک وسیع خلیج حائل ہو گئی ہے ۔ستم ظریفی یہ ہے کہ تعلیم‘ جس کا بنیادی مقصد ہی معاشرے میں معاشرتی اور معاشی امتیازات کو کم کرنا ہے‘ ان امتیازات کو مزید تقویت دے رہی ہے۔

سرکاری سکول اب اپنی کشش کھو بیٹھے ہیں۔ والدین اب اپنے بچوں کو انگلش میڈیم سکولز میں بھیجنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور وجوہات کے علاوہ اس کی ایک اہم وجہ انگریزی زبان ہے۔ والدین انگریزی زبان کو معیار کا پیمانہ سمجھتے ہیں‘ انگریزی زبان کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے گلی محلوں میں غیر معیاری سکول بھی وجود میں آ گئے ہیں جوانگلش میڈیم کا بورڈ لگا کر اپنے معیاری ہونے کا اعلان کر رہے ہیں۔

والدین انگریزی کو ہی کیوں اچھے سکولوں کی علامت سمجھتے ہیں ؟ اردو میڈیم سکولوں سے بے اعتنائی کی وجہ کیا ہے ؟ اس بظاہر سادہ سوال کا جواب

Downloaded From Tajassus.com

اتنا آسان نہیں۔ اس کے لیے ہمیں زبان سے جڑے کچھ اور سوالوں کا جواب بھی تلاش کر نا ہو گا۔

زبانوں سے متعلق یہ اہم حقیقت ہے کہ کوئی بھی زبان اپنی اصل میں برتر یا کم تر نہیں ہوتی۔کسی بھی زبان بولنے والنے کا معاشرتی مرتبہ اس زبان کا سماجی مرتبہ متعین کرتا ہے‘ انگریزی زبان کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔انگریزی اپنی عملیت (Pragmatic Value) کی وجہ سے ایک طاقت ور زبان کے طور پر سامنے آئی ہے ‘کیونکہ اس کا حصول اچھے روزگار کے راستے کھولنے میںمد د دیتا ہے ۔

اسی طرح انگریزی میں دسترس باہر کی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے۔پاکستان میںآج کل ملٹی نیشنل کمپنیوں میں روزگار کے حوالے سے اشتہارات دیکھیں تو ان میں دو اوصاف کا ذکر التزام سے کیا جاتا ہے ایک تو کمیونیکیشن سکلزاور دوسرا انٹر پرسنل سکلز۔

انگریزی میں مہارت اور پھر اس پر ایک خاص لہجہ امیدواروں کو نوکری کے حصول کے لیے ہونے والے انٹرویوز میں بہت مدد کرتا ہے۔ یوں انگریزی زبان صرف خیالات اور معلومات کی ترسیل (Communication)کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ یہ اس سے بڑھ کر ایک سیاسی تصور ہے جس کا تعلق طاقت سے جڑا ہوا ہے۔

فرانسیسی ماہر عمرانیات بورڈیو (Bourdieu)کا طاقت کا تصور اس کی کیپٹل تھیوری کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ اس کے خیال میں اکنامک کیپٹل سوشل کیپٹل اور کلچرل کیپٹل طاقت کے استعارے ہیں۔ کلچرل کیپٹل کا ایک اہم جزو لسانی سرمایہ بھی ہے۔ بورڈیو کے خیال میںیہ Capitals کسی بھی معاشرے میں پاورکی تعمیر اور تشکیل کرتے ہیں۔

بورڈیو زبان کو محض خیالات اور معلومات کی ترسیل کا ذریعہ نہیں سمجھتا بلکہ اسے طاقت کا آلہ قرار دیتا ہے۔ اس کے خیال میں کوئی فرد جب بولتا ہے تو اس کا مدعا محض دوسروں کو اپنا مطلب سمجھانا نہیں ہوتا بلکہ وہ چاہتا ہے کہ اس پر یقین کیا جائے ‘اس کی تعمیل کی جائے ‘اس کی تکریم کی جا ئے اور اسے دوسروں سے ممتاز سمجھا جائے ۔

زبان کے اس معاشرتی مرتبے کو سکولوں میںمزید جواز فراہم کیا جاتا ہے‘ یوں سکول معاشروں میں طاقت کے محوروں کو آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں ۔

Downloaded From Tajassus.com

برطانیہ کا برنسٹین (Bernstein) جو زبان کی عمرانیات کا ماہر ہے لسانی سرمائے (Linguistic Capital)کی غیر مساوی تقسیم کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اپنے معروف تحقیقی مضمون: Elaborated and Restricted Codesمیں وہ بتاتا ہے کہ کیسے ورکنگ کلاس کی زبان سکول کے تعلیمی ٹاسک اور اسائن منٹس کے حوالے سے زیادہ مددگار نہیں ہوتی ۔

انگلش میڈیم سکول والدین کی توجہ کا دامن اپنی طرف اس لیے کھینچ لیتے ہیں کہ ان کا دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ بچوںکو انگریزی بول چال میں طاق کر دیں گے ۔

جو لسانی سرمایہ بچے اپنے گھروں سے حاصل کرتے ہیں وہ سکول میں ان کی تعلیمی کارکردگی میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔وہ بچے جن کے خاندان معاشی اور معاشرتی طور پر بلند درجے پر ہوتے ہیں ان کا لسانی سرمایہ بھی زیادہ ہوتا ہے ۔

وہ معاشرے میں ان ایلیٹ سکولوں میں جاتے ہیں جہاں نصاب ‘درسی کتب ‘اساتذہ کی کوالٹی ‘طریقۂ تدریس اور امتحانات کا طریقہ خاصا بہتر ہوتا ہے‘ اس کے برعکس وہ بچے جن کا تعلق ایسے خاندانوں سے ہوتا ہے جن کے معاشی ذرائع محدود ہوتے ہیں وہ زیادہ تر ان سکولوں میں جاتے ہیں جہاں نصاب‘ درسی کتب‘اساتذہ کی کوالٹی‘امتحان کا نظام نسبتاً کم درجے کا ہوتا ہے۔

ایسے سکولوں میں اساتذہ کی اکثریت انگریزی خاص کر روانی سے انگریزی بولنے میں مہارت نہیں رکھتی۔ یوں امرا کے بچے جو پہلے سے انگریزی کے حوالے سے لسانی سرمایہ رکھتے ہیں وہ ان ایلیٹ سکولوں میں چلے جاتے ہیں جہاں اس سرمائے میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔

اس کے برعکس غریبوں کے بچے‘ جن کے پاس انگریزی حوالے سے کم لسانی سرمایہ ہوتا ہے وہ معاشی وسائل کی کمی کے باعث صرف ایسے سکولوں تک رسائی حاصل کر سکتے ہیںجہاں انگریزی کے حوالے سے ان کے لسانی سرمائے میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوتا۔ خاص کر انگریزی بول چال میں ان کی کارکردگی میں کوئی نمایاں بہتری نہیں آتی‘ اس کے نتیجے میں امیروں اور غریبوں کے درمیان تفریق کی لکیر اور گہری اور نمایاں ہو جاتی ہے۔

انگریزی میں یہ لسانی سرمایہ طلبا کے حصول ِروزگار کے عمل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ وہ طلبا جن کی انگریزی پر دسترس ہوتی ہے انہیں بہتر روزگار ملنے کے زیادہ مواقع ہوتے ہیں۔یوں معاشرے میں سماجی تفریق و تفاوت کو ہمارا غیر

Downloaded From Tajassus.com

مساوی نظام تعلیم اور بڑھاوا دے رہا ہے۔ اس سلسلے میں انگریزی زبان اہم کردار ادا کر رہی ہے۔

انگریزی زبان کو پاکستان میں اہم مقابل ملنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے قومی زبان اردو کے حوالے سے محض بلند بانگ دعوے کیے اور اس سلسلے میں کوئی کام نہیں کیا۔1947ء میں ہونے والی پہلی ایجوکیشنل کانفرنس میں بتدریج اردو کے نفاذکا ذکر کیا گیا تھا۔ 1959ء میں بننے والے کمیشن کی رپورٹ میں پندرہ سال میں اردو کے نفاذ کی بات کی گئی تھی ۔

1973ء کے آئین میں اردو کو انگریزی کی جگہ سرکاری زبان بنانے کے لیے مزیدپندرہ سال کا وقت دیا گیالیکن عملی طور پر کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا گیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ملکی سطح پر اس بات کا اہتمام کیا جاتا کہ دنیا بھر میں شائع ہونے والی جدید کتابوں اور تحقیقی مقالوں کو سرعت کے ساتھ اردو میں ترجمہ کیا جاتا جس طرح کئی ایسے ممالک میں کیا جاتا ہے جہاں ملکی زبان پر فخر کیا جاتا ہے۔

اردو اور علاقائی زبانوں سے بے اعتنائی کے نتیجے میں پاکستان میںانگریزی کا معاشرتی درجہ رفتہ رفتہ بلند ہوتا گیا۔ یہ بات اہم ہے کہپاکستان میں بننے والی کسی تعلیمی پالیسی میں زبان کے مسئلے پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ملکی سطح پر ایک جامع لسانی پالیسی تشکیل دی جائے جس میں انگریزی'اردو اور پاکستان کی علاقائی زبانوں کے بارے میں تفصیلی بحث کی جائے اور قابلِ عمل ٹھوس تجاویز دی جائیں۔

ANS 03

نصاب کی تدوین ہر ملک کا بنیادی تعلیمی مسئلہ ہوتا ہے۔ پاکستان کی بدقسمتی یہ ہے کہ جہاں اور بہت سی برائیاں انگریزوں سے ورثے میں ملی ہیں ان میں ایک نظام تعلیم بھی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سے ہمارے ملک میں انگریزوں کے تیار کردہ نظام تعلیم کے تحت ہی تعلیمی عمل ہماری درسگاہوں میں جاری و ساری ہے، بدقسمتی سے آج تک ہمارا نصاب تعلیم پرانی ڈگر پر ہی چل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکے جن کے لئے پاکستان وجود میں آیا تھا۔ بلاشبہ اگر کسی قوم یا ملک کے بارے میں یہ معلوم کرنا ہو کہ اس ملک کے رہنما یا اکابر شہریوں کو کیا بنانا چاہتے ہیں اور ملک کے مستقبل کے بارے ان کے کیا نظریات ہیں تو ان کا جواب اس ملک کے نصاب تعلیم یا نظام تعلیم سے مل جاتا

Downloaded From Tajassus.com

ہے۔ نصاب تعلیم قوم کے مقاصد کا آئینہ ہوتا ہے اور نظام تعلیم میں سب سے زیادہ اہمیت اس کی ہوتی ہے۔ بلاشبہ ہر قوم کا ایک مخصوص نظریہ حیات ہوتا ہے جس کو مدنظر رکھ کر ایک قوم اپنے مقاصد حیات کا تعین کرتی ہے۔ جب مقاصد تعلیم کا تعین ہو جاتا ہے تو اس مقصد حیات کو مدنظر رکھ کر مقاصد تعلیم مقرر کئے جاتے ہیں۔ مقاصد تعلیم کا تعین کر دینا بذات خود کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اصل مسئلہ مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ ان تعلیمی مقاصد کیلئے جو لائحہ عمل یا طریقہ کار اختیار کیا جاتا ہے اس کو نصاب کہتے ہیں یعنی نصاب منزل مقصد تک پہنچانے کے ذریعے کا نام ہے۔ ہمارا نصاب تعلیم تو ایک ہونا چاہئے تھا تاکہ ہم حقیقی معنوں میں ایک قوم بن سکتے مگر ایسا نہیں ہے۔ سینکڑوں اقسام کے تعلیمی ادارے، سرکاری غیر سرکاری، انگلش میڈیم، اردو میڈیم، مشنری سکولز، کالج، کمیونٹی سکولز اور کالجز، دینی مدارس، کیڈٹ سکولز اور کالجز، دینی مدارس کو پھر کئی گروپوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے مثلا حنفی دیوبندی مدارس، حنفی بریلوی مدارس، اہلحدیث مدارس، فقہ جعفریہ کے شیعہ مدارس وغیرہ۔ اب ان درج بالا تمام مدارس میں علیحدہ علیحدہ نصاب پڑھایا جاتا ہے بلکہ ایک گلی محلے یا شہر میں اگر 50 تعلیمی ادارے ہیں تو یقین کیجئے ان پچاس تعلیمی اداروں میں علیحدہ علیحدہ نصاب پڑھایا جاتا ہے۔ جب ہم نظام تعلیم کے موجودہ ڈھانچے کی بات کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں یہ بات واضح طور پر موجود ہونی چاہئے کہ یہ ڈھانچہ آزادی سے قبل عہد غلامی میں لارڈ میکالے کے تیار کردہ تعلیمی پالیسی کی بنیادوں پر استوار کیا گیا تھا اس کے پانچ بنیادی مقاصد تھے (1) انتظامی مشینری کیلئے کلرکوں سے لے کر آئی سی ایس افسروں تک تاج برطانیہ کے وفادار اور سستے ملازمین کی کھیپ تیار کرنا (2) مغربی تہذیب اور افکار و نظریات کے غلبے کے لئے انگریزی زبان کو وسیلہ بنانا اور اس کے ذریعہ مغرب کے سرچشمہ علم و اقتدار سے قلب و نظریہ کا رشتہ اس طرح جوڑے رکھنا کہ نوآبادیاتی دور کے خاتمے کے بعد بھی یہ ربط و تعلق اپنی جگہ برقرار رہے (3) غیر پیداواری افرادی قوت فراہم کرنا (4) عیسائیت کو فروغ دیا جائے اور مقامی لوگوں کی بڑی سے بڑی تعداد کو اپنا ہم مذہب بنا کر ان کو وطن اور اصل معاشرے سے کاٹ دیا جائے (5) معاشرتی زندگی کا مربوط ڈھانچہ توڑ کر اس کی متحدہ قوت کو پارہ پارہ کیا جائے اور مختلف طبقات وجود میں لا کر انہیں باہم متصادم کر دیا جائے تاکہ ان کا رخ ایک دوسرے کی طرف

Downloaded From Tajassus.com

رہے ہماری طرف نہ ہو۔ ان مقاصد کے حصول کیلئے تعلیمی نظام کا پورا ڈھانچہ تبدیل کر دیا گیا۔ وفادار امرا، رؤسا، راجوں، مہاراجوں اور نوابوں کیلئے علیحدہ نصاب اور اعلیٰ سہولتوں کے تعلیمی ادارے قائم ہوئے۔ آزادی کے 71 سال بعد اپنے ارد گرد نظر ڈالئے کیا ہمارا پورا نظام تعلیم انہی بنیادوں پر کھڑا ہوا نہیں ہے جو انگریزی کے دور میں رکھی گئی تھیں؟ کیا ہم اس میں کوئی ادنیٰ سی تبدیل کر سکے ہیں؟ کیا ہم نے اس کی طبقاتی بنیادیں اور اس کا نوآبادیاتی کردار بدل دیا ہے۔ اسلام نے حصول علم کو تمام مسلمان مردوں اور عورتوں کا فریضہ قرار دیکر اسے ہوا اور پانی کی طرح بلاقیمت اور حسب توفیق و اہلیت رکھا تھا۔ اسلامی معاشرہ نوآبادیاتی دور سے قبل پوری اسلامی دنیا میں تعلیم کی فیس سے ناآشنا رہا۔ شہزادوں اور عام لوگوں کے لئے ایک الگ مدارس کے قیام سے بیگانہ رہا۔ اس نے تو مسجد کی طرح مدرسہ میں بھی کامل مساوات برقرار رکھی۔ شہزادوں کو تاخیر سے مدرسے آنے پر غریبوں کی جوتیوں کے درمیان بٹھا دیا اور علم کی دنیا سے چھوٹے بڑے کا ہر امتیاز مٹا دیا۔ اسلام کے معلم آخر و اکمل حضرت محمدﷺ نے مسجد نبوی میں صفہ پر جو مثالی مدرسہ قائم کیا اس کے چشمۂ فیض سے بے سہارا، غریب نادار اور کئی کئی وقت کا فاقہ کرنے والے سب سے زیادہ سیراب ہوئے۔ علم غرباءکی میراث بنا۔ ہمارے محدثین، مفسرین، فقہا، مورخین، ریاضی دان حکما، سائنسدان اور مختلف علوم و فنون کے ماہرین سب پسماندہ اور متوسط طبقے سے ابھر کر آسمان علم پر آفتاب اور ماہتاب بن کر چمکے۔ ذرا انگلیوں پر حساب لگا کر دیکھئے کہ ہمارے اکابرین علم میں شہزادوں اور نوابزادوں کا تناسب کیا ہے؟ یقین جانئے کہ ہم مدرسہ کی مساوات بحالی کئے بغیر معاشرے میں کبھی مساوات قائم نہیں کر سکتے۔ مساوات تو کجا ہم اس کے بغیر ایک متحد و منظم قوم بھی وجود میں نہیں لا سکتے۔ ایک قوم بننے کےلئے ہم زبان ہونا، یکساں نصاب ہونا، مشترکہ نصب العین اور نقطہ نظر کی آہنگی سے ہمکنار ہونا، یکساں تاریخی اور ثقافتی شعور کا حامل ہونا، اشتراک و تعاون کے رشتوں میں منسلک ہونا اور شراکت جذبات و احساسات کا موجود ہونا ضروری ہے۔ ایک مخصوص نصاب محض معلومات، طباعت اور کاغذ وغیرہ کے لحاظ ہی سے مختلف نہیں ہوتا، اپنے تاثرات کے لحاظ سے بھی قطعی مختلف ہوتا ہے اور اس کے تحت تعلیم پانے والوں کے ظاہر و باطن میں ایک مخصوص رنگ جھلکنے لگتا ہے۔ ایچیسن کالج کے دو طالب

Downloaded From Tajassus.com

علموں کو باہم مل کر جو خوشی محسوس ہوتی ہے اور جو احساس یگانگت ان کے اندر ابھرتا ہے وہ ایچیسن اور دیال سنگھ کالج کے دو طالب علموں کی ملاقات میں نظر نہیں آتا۔ دونوں ہم وطن ہیں ہم مذہب ہیں مگر ان کے درمیان کوئی وحدت فکر و نظر نہیں۔ ان کی دلچسپیاں الگ ہیں، موضوعات گفتگو الگ ہیں، انکے اندر محبت کی بجائے مغائرت کی دیوار کھینچی ہوئی محسوس ہو گی۔ آخر ان دونوں کو کس نے ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ ایک ہی وطن میں رہتے ہوئے اجنبی بنا دیا۔ ایک ہی قوم سے وابستگی کے باوجود انہیں ایک دوسرے کا حریف بنا دیا۔ یہ کرشمہ ہے ایچیسن اور دیال سنگھ کالج کے مخصوص اور جداگانہ نظام تعلیم کا۔ ہمیں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ تعلیمی نظام کی یک رنگی سے قومی یک رنگی ابھرے گی، ہمارے مدارس جتنے رنگوں میں رنگے ہوئے ہوں گے اتنے ہی رنگوں کی قوم وجود میں آئے گی اور یہ مختلف رنگ ظاہر اور باطن دونوں پر چھائے ہوئے ہوں گے۔ ایک متحد و مربوط قوم بننے کےلئے ضروری ہے کہ ہمارے تمام تعلیمی اداروں میں ایک ہی نصاب تعلیم پڑھایا جائے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے ایک قوم بننے میں سب سے بڑی رکاوٹ تو ہمارا نظام تعلیم اور نصاب تعلیم ہے۔ جب تک اس کی لسانی دوئی، دینی اور دنیوی دوئی، طبقاتی دوئی ملکی اور غیرملکی نصاب کی دوئی ختم نہیں ہو گی یہ قوم کے اندر اتحاد و یکجہتی کا ذریعہ کیسے بن سکتا ہے؟ تعلیم قیام عدل کا، اخوت و مساوات کے رشتوں کی استواری کا سب سے اہم ذریعہ ہے لیکن یہ خود ہی ظلم پر مبنی ہو اور طبقاتی فرق و امتیاز سے وابستہ ہو تو اس سے عادلانہ معاشرے کے قیام کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے؟

ANS 04

کسی بھی ملک کا ادب اس کے ماحول ،معاشرت،مذہب، تہذیب و تمدن، اجتماعی خوابوں اور عوامی آرزؤں کا ترجمان ہوا کرتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد تخلیق پانے والے شعر اور نثری ادب کو ہم بجا طور پر پاکستانی ادب قرار دے سکتے ہیں۔ اس کی نمایاں خصوصیات کا مطالعہ کرنے سے قبل لازم ہے کہ پاکستانی ادب کی تعریف کا تعین کر لیا جائے ۔ مختلف ادیبوں نے اپنے اپنے انداز میں اس کی تعریف وضع کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں سے چند ادیبوں کی وضع کردہ تعریفیں درج ذیل ہیں۔

فیض احمد فیض کے بقول:۔

Downloaded From Tajassus.com

’’پاکستانی ادب وہ ہے جس میں پاکستانی روایات،حالات، پس منظر اور پیش منظر سے مطابقت موجود ہو۔ اس میں مقامیت کے مقاصد کے ساتھ آفاقیت بھی موجود ہے‘‘۔(۱)

احمد ندیم قاسمی کہتے ہیں۔

’’پاکستانی ادب سے مراد ہے وہ ادب جو پاکستان کے وجود ، پاکستان کے وقار اور پاکستان کے طریقے کا اثبات کرتا ہو اور جو پاکستان کے تہذیبی و تاریخی مظاہر کا ترجمان ہواور جو یہاں کے کروڑوں باشندوں کی امنگوں اور آرزوؤں نیز شکستوں اور محرومیوں کا غیر جانبدار عکاس ہو۔ ظاہر ہے اس صورت میں پاکستانی ادب ،ہندوستانی ادب یا ایرانی ادب یا چینی ادب یا انگریزی ادب سے مختلف ہو گا‘‘۔(۲)

میرزا ادیب کی رائے ہے کہ:

’’وہ ادب جو پاکستان میں رہنے والے ادیبوں نے وجود پذیر کیا ہے۔ پاکستانی ادب ہی کہلائے گا،،(۳)

ڈاکٹر سلیم اختر نے پاکستانی ادب کی تعریف ان الفاظ میں متعین کی۔

’’پاکستانی ادیب کا لکھا ہوا وہ ادب جس میں پاکستانی قوم کے مسائل و ابتلا کا تذکرہ ہو یا جس سے پاکستانی قوم کا تشخص اُجاگر ہوتا ہو، اسے پاکستانی ادب قرار دیا جا سکتاہے۔‘‘(۴)

پاکستانی اد ب کے حوالے سے احمد جاوید کا خیال ہے کہ:

’’قوم جس راستے سے گزرتی ہے اس کے نقوش اس کی تہذیب مزاج اور ادب پر ثبت ہوتے ہیں۔ پاکستانی قوم بھی جس راستے سے گزر کر یہاں پہنچی ہے وہ راستہ پاکستانی ادب کا راستہ ہے۔‘‘(۵)

ڈاکٹر سلطانہ بخش پاکستانی ادب کو ایک ایسے پہلو دار ہیرے سے تشبیہ دیتی ہیں جس کا ہر پہلو اپنی الگ آب و تاب رکھتا ہے۔مجموعی طور پر یہ ادب ایک وحدت اور ایک اکائی ہے۔(۶)

مندرجہ بالا سطور میں درج مختلف ادباء کی آراء سے ظاہر ہے کہ پاکستانی ادب ایک الگ شناخت اور پہچان رکھتا ہے۔ پاکستانی ادب ہماری کامرانیوں اور تشنہ کامیوں، بربادیوں اور شادابیوں ، احساسِ زباں اور اعترافِ تشکر کی مستند قومی دستاویز اور معتبر میزانیہ ہے۔

Downloaded From Tajassus.com

پاکستانی ادب نے اپنے دامن میں جہاں پندرہ کروڑ پاکستانی عوام کے ریزہ ریزہ خوابوں کی کرچیاں ، اداسیاں اور محرومیاں سمیٹ لی ہیں۔وہاں خواص کی بداعمالیاں اور بے اعتدالیاں بھی محفوظ کر لی ہیں۔

بلا شبہ ہمارے شعر و ادب میں ہماری خاک کے تمام خواب اور عذاب مکمل طور پر سمٹ آئے ہیں۔ پاکستانی ادب کی تاریخ خواب ، اور انقلاب ، تعمیر اور حسرتِ تعبیرہو شربا داستان ہے۔ اس کا مطالعہ درحقیقت پاکستانی کے باطنی وجود اور اوج تک رسائی کے مترادف ہے ۔ وطن عزیز کی شخصیت اور نفسیات مزاج اور معاشرت طرز احساس اور طرز فکر کو سمجھنے کے لیے اس کی معاشی، سیاسی، سماجی، تہذیبی ، اور ثقافتی تاریخ کے ساتھ ساتھ اس کی ادبی تاریخ کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔

آزادی کے بعد کے برسوں میں رفتہ رفتہ علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کے اشتراکِ عمل سے پاکستان میں اردو کا ایک نیا لہجہ منفرد آہنگ اور جدا اسلوب وضع ہوتا چلا گیا اور اب تک پاکستانی زبان و ادب کے واضح خدوکال صورت پذیر ہو چکے ہیں ۔ آج کی پاکستانی اردو کلاسیکی اردو سے واضح طور پر ممتاز اور منفرد ہے۔ پاکستانی اردو کی اپنی الگ رنگت اور Shadesوضع ہو چکے ہیں۔ الفاظ کے قدیم معنی تبدیل ہو چکے ہیں۔ نئے محاورے پاکستانی اردو میں شامل ہو چکے ہیں۔ پاکستانی ارد و میں صرفی اور نحو ی تبدیلیاں بھی وقوع پذیر ہو چکی ہیں ۔ پاکستانی قلمکاروں نے اپنے متون (Tects) میں ساختیاتی سطح پر بہت سے نئے تجربے بن رہے ہیں۔ انہوں نے اسلوبیاتی حوالے سے پہلے سے متعین قواعدی معیارات سے بھی انحراف کی روش اختیار کی ہے۔ پاکستانی ادب میں پاکستان کے مختلف علاقوں کی لسانی بو باس شامل ہو رہی ہے اور پاکستانی Landscapeبھی منعکس ہو رہا ہے۔

فسادات کا المیہ ، ہجر ت کا کرب ، غیر مستحکم سیاسی نظام، آمریت کا تسلسل ۱۹۶۵ء اور ۱۹۸۱ء کی جنگیں، مسئلہ افغانستان اور مسئلہ کشمیر وغیرہ پاکستانی دور کے ادب کے شعری اور نثری ادب کے نمایاں موضوعات رہے ہیں۔ علاقائی زبانوں کی ادبیات کے ساتھ ساتھ پاکستانی ادب نے عالمی ادبی تحریکوں کے اثرات بھی قبول کیے ہیں۔پاکستانی ادب کے واضح خدوخال اور نقش و نگار اس کے شعری اور نثری ادب کے آئینے میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس

Downloaded From Tajassus.com

لیے آئندہ سطور میں ہم پاکستانی ادب کے نمایاں رُجحانات کا مطالعہ پیش کر یں گے۔

قیام پاکستان سے لے کر اب تک پاکستان میں لکھی جانے والی غزل اپنے مزاج اسلوب ، لفظیات ، تشبیہات، استعارات،علامات، موڈ اور مواد کے لحاظ سے منفرد پہچان وضع کر چکی ہے۔ ہجر او رفسادات کے موضوعات سے لے کر سیاسی سماجی عدم مساوات تک ،پاکستان کے دو لخت ہونے سے لے کر مسئلہ افغانستان تک ،سیاسی ڈھانچے کی فرسودگی سے لے کر ہر طرح کی آلودگی تک، خوفناک معاشی پسماندگی سے لے کر نہایت ہی شرمناک شرح خواندگی تک کوئی اہم خوبی موضوع ایسا نہیں ہے جس کا عکس پاکستانی غزل میں موجود نہ ہو ۔ پاکستانی تاریخ اور معاشرت کے مختلف پہلو اس صنفِ سخن میں اختصار مگر جامعیت کے ساتھ سمٹ آئے ہیں۔ ساٹھ اور ستر کی دہائیوں میں بالخصوص خالص پاکستانی غزل کا مزاج متشکل ہوا ہے۔ ستر کی دہائی کے غزل گو شعرا ء نے اظہر کے نئے قرینے تراشے ان کی لکھی غزلیات میں داخلی قوافی ، تکرارِلفظی، جوڑے دار الفاظ ، اصنافتوں سے اجتناب ، پرندوں جانوروں حشرات الارض، داستانوی کرداروں ، انگریزی الفاظ اور استفہامیہ اشعار کی کثرت سے بحث کوئی پاکستانی غزل نے پرانی لغت اور لفظیات سے دامن چھڑالیا ہے۔(۵)

تنویر سپرا، سبطِ علی صبا، اور علی مطہر اشعر کی صنعتی ماحول کی ترجمان غزل ہو یا محمد خالد غلام حسین ساجد، ثروت حسین ،صابرظفر ،محمد اظہار الحق اور خالد اقبال یا سر کی اساطیری غزل-- ناصر کاظمی کی طویل مسلسل غزل سے لے کر فرحت عباس شاہ کی ایک حکومتوں کی دین ہیں۔اسی طرح وطن پرستی کی حامل نظموں کی تخلیق ۱۹۶۵ء کی جنگ کی عطا۔۱۹۶۵ء کی ستم زدہ روزہ پاک بھارت جنگ کے نتیجے میں بے شمار نظمیں اور رجزیہ اشعار معرضِ تخلیق ہیں ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے خیال میں اس جنگ کے نتیجہ میں خالص پاکستانی ادب کی بنیاد پڑی اور ادب میں وہ خطِ فاصل واضح تر ہو گیا جس کا تصور تقسیم ملک کے باوجود ابھی تک دھندلا اور مبہم تھا۔۱۹۷۷ء کے المیہ نے پاکستانی ادب پر براہِ راست اثرات مرتب کیے تو نظم اور افسانے پر اس کا بالواسطہ اثر پڑا۔

Downloaded From Tajassus.com

سید محمد جعفری ، نذیر احمد شیخ، مجید لاہوری، دلاور فگار، ضمیر جعفری، انور مسعود ،سرفراز شاہد کی مزاحیہ نظم پاکستانی معاشرت کی آئینہ دارہے۔

پاکستانی نظم نگاروں نے ملکی، قومی اور بین الاقوامی مسائل کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا اور اپنے گہرے تہذیبی شعور، تخلیقی آگہی اور جدید طرز احساس کے حوالے سے نقطہ ،کمال پہ لاکھڑا کیا۔ بحیثیت مجموعی پاکستانی نظم ہماری سیاسی بیداری اور تہذیبی وقوف کی بہترین ترجمان ہے۔

نعت گوئی پاکستان میں تخلیق پانے والے شعری ادب کی نمایاں انفرادیت قرار دی جا سکتی ہے۔ نعت پاکستانی ادب کی مقبول صنفِ سخن کے طور پر ادبی افق پر نمودار ہوئی ہے۔ اس کی مقبولیت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ صنف قیام پاکستان کے بنیادی مقدرسے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ پاکستان میں نعت گوئی کا رجحان اتنا فروغ پذیر ہو اہے کہ جو شاعر پہلے صرف غزل گو کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے وہ بھی نعت کہنا اپنے لیے باعث فخر سمجھنے لگے ہیں۔بحر میں قافیہ ردیف کی پابندی سے آزاد مسلسل غزل تک ، سلیم احمد اور خلیل رامپوری کی اینٹی غزل سے لے کے ظفر اقبال ، رئیس فروغ اور انور شعور کی تغزل شکن تجرباتی غزل تک ، فارغ بکاری ،قتیل شفائی اور سجاد مرزا کی آزاد غزل سے لے کر ، عدیم ہاشمی کی مکالماتی غزل تک ، انور مسعود، سرفراز شاہد اور انعام الحق جاوید کی مزاحیہ غزل سے لے کر حفیظ الرحمن احسن کی طنزیہ غزل تک مشتاق باسط کی نثری غزل سے لے کر شیر افضل جعفری اور علی اکبر عباس کی علاقائی لب و لہجہ کی حامل غزل تک ، ناصرشہزاد سے لے کر اسلم کولسری کی پنجابی بحور میں لکھی گئی غزل تک،پاکستانی غزل میں انفرادی تجربات اور موضوعات کی متنوع جہات موجود ہیں۔ مختصراًیہ کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں لکھی جانے والی غزل پاکستانی (Landscape)، پاکستانی ثقافت اور کلچر کی مکمل ترجمان ہے۔

غزل کے ساتھ ساتھ پاکستانی نظم نے بھی پاکستانی زندگی کی حقیقت افروز ترجمانی کا فریضہ سر انجام دیا ہے ۔ پاکستان میں لکھی جانے والی نظم اپنے موضوعات او رہیئتی تجربات کے حوالے سے قابل مطالعہ ہے۔ پاکستان میں تہہ دار معنیاتی پیٹرن کی حامل نظموں کا آغاز ہوا تو یہ سلسلہ وسعت پذیر ہوتا چلا گیا۔ پاکستانی نظم پر عالمی ادب کے اثرات کا نتیجہ تھا کہ

Downloaded From TajaSsus.com

۱۹۵۵ء لگ بھگ پاکستانی ادبی منظر پر ابھرنے والے جدید نظم میں ہیئت کے تجربات کو فروغ دیا۔ پاکستانی نظم میں ہیئت کے تجربات کے حوالے سے ن۔م راشد ، مجید امجد ، جیلانی کامران جعفر طاہر، اور قیوم نظر کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ پاکستانی نظم میں مزاحمت اور احتجاج کے رویے وطن عزیز میں مسلسل آمرانہ ڈاکٹر ریاض مجید نے بجا طور پر اس رائے کا اظہار کیایہ کہ۔

’’ اردو نعت کا عصرِ حاضر جیسے قیام پاکستان سے شروع کیا جا سکتا ہے ایک اعتبار سے لغت کے عصرِ جدید ہی کی توسیع ہے۔‘‘(۸)

تقسیم برصغیر کی وجہ سے ہجرت کا المیہ اور خاک و خون کا سمندر عبور کر کے ارضِ پاکستان پر قدم رکھنا بھی نعت لکھنے کا اہم محرک ہوا۔ ہجرت کے کر جانے، بار گاہِ رسالت ؐ میں عرضِ حال بیان کرنے پر شعرا کو مجبور کیا اور پھر ارضِ پاک میں نعت گو ئی کے لیے فضا ساز گار ہوتی چلی گئی۔۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں کے بعدنعت گوئی کی طرف پاکستانی شعراء کی توجہ بہت زیادہ بڑھ گئی۔ بالخصوص۔۱۹۷۷ء میں جنرل ضیاء الحق کے دورِ حکومت سے پاکستان میں نعت کے د ورِ زریں کا آغاز ہوا۔جب حکومتی سطح پر صنفِ نعت کے فروغ کے لیے بھٹو میں اقدامات اٹھائے گئے اسی دورمیں ذرائع ابلاغ نے نعت گوئی کی اشاعت کے حوالے سے بڑا نمایاں کردار اد ا کیا ۔ آج پاکستان کا نقشہ شعری ادب سوچ اور اظہار کے متنوع قرینوں سے معمور ہے۔ نعت اب صرف حضور اکرمؐ کے شمال ، فضائل اور خصائل تک محدود نہیں رہی بلکہ اس سے سیرتِ اطہرؐ کی روشنی بھی پھوٹ رہی ہے۔ پاکستان میں نعت نگاری کا شعور ایک زندہ اور فعال تحریک کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ پاکستان میں کوئی نصابی کتاب ، کوئی ادبی جریدہ، اور کوئی علمی اور ادبی محفل نعت کی شمولیت کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی۔ جدید پاکستانی نعت مسلم امہ کی محرومیوں کا نوحہ ہے۔ بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم لے جانے کی آرزو آج کی پاکستانی نعت کا بنیادی رویہ بن چکا ہے۔اظہار کے اسالیب اور مضامین نو کے حوالے سے پاکستانی نعت نہایت ثروت مند صنفِ سخن ہے۔ سہ مصرعی نعتیہ نظموں کا رواج عام ہو رہا ہے، نعتیہ ثلاثی اور ہائیکوبھی نعت کے شعرا کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا رہے ہیں۔ نعت بلاشبہ ا س وقت پاکستانی ادب کی ہر دالعزیز صنفِ سخن بن چکی ہے۔ پاکستانی نعت میں ارضی صداقتوں کا ظہور

Downloaded From Tajassus.com

بھی ہے اور زمینی حقائق کا شعور بھی ۔ جدید پاکستانی نعت میں جبرِ مسلسل کی صورت پذیری کے کٹھن مراحل کا مشاہدہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

حمد نگاری اور مرثیہ گوئی بھی پاکستانی ادب کا اختصاص ہے۔ پاکستانی مرثیہ نگار شعرا نے عصر حاضر میں بپا ہونے والی یزیدی یلغار اور آمریت کے طغیان میں سانحے کربلا کی صدائے صداقت کو زندہ کیا ہے۔ پاکستانی شاعری میں بالعموم اور ان اصناف میں بالخصوص واقعہ کربلا بطور استعارہ استعمال ہو رہاہے۔

ستر کی دہائی میں دو نئی اصنافِ سخن یعنی ماہیا اور ہائیکو کا پاکستانی شعری ادب میں آغاز ہوا۔ ماہیا پنجابی ادب کی معرفت پاکستانی ادب میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوا۔ جب کہ ہائیکو جاپان سے درآمد کی گئی صنفِ سخن ہے۔ اگرچہ ہمارے ہاں ابھی تک ان دونوں اصناف کے اوزان اور بحور پر بحثیں جاری ہیں تاہم ہمارے تخلیق کار وں نے مختلف اوزان اور بحور میں ماہیا اورہائیکو لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔ ماہیا میں ہمارے شعر انے پاکستان کی دیہی معاشرت اور ثقافتی مظاہر کی ترجمانی کا فریضہ بھی نہایت عمدگی سے ادا کیا ہے۔ مزید یہ کہ سماجی جبر کو بھی ماہیا نگاوروں نے اپنے ماہیوں میں فنی قرینے کے ساتھ سمویا ہے۔جہاں تک ہائیکو کا تعلق ہے اس کے موضوعات کا دائرہ محدود نہیں ہے۔ پاکستانی ہائیکو نگاروں نے ا س کی موضوعاتی جہتوں میں اضافے لکھا ہے۔ پاکستانی ہائیکو جاپانی مزاج سے قطع نظر کرتے ہوئے ہمارے شعرا کی تخلیقی صلاحیتوں کی وجہ سے اپنا منفرد مزاج متعین کرنے کے مراحل سے گزر رہا ہے۔نثری ادب میں افسانہ اپنے موضوعات کی وسعت فکر ونظر کی گہرائی اور زبان و بیا ن کے تنوع کے لحاظ سے پاکستانی ادب کی سب سے زیادہ توانا اور موثر صنف کے طور پر ابھرا ہے۔ پاکستان کی سیاسی، سماجی، معاشرتی اور ثقافتی تاریخ اس صنف میں محفوظ ہوتی چلی گئی ہے۔ زندگی کے بدلتے معمولات کے ساتھ ساتھ نئے نئے موضوعات پاکستانی افسانہ نگاروں کی توجہ کا مرکز بنتے رہے ہیں فسادات کے بعد ماضی پرستی ہمارے ، افسانے کا دوسرا بڑا موضوع رہی ہے۔ نئی سر زمین پر جب لوگوں کو وہ وخواب پورے ہوتے نظر نہ آئے جنہیں آنکھو ں میں سجائے وہ اس سر زمین پر پہنچے تھے تو ان پر مایوسی اور دل شکستگی کی کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ یہی وہ فضا تھی جس میں ہمارے شروع کے افسانہ نگاروں نے سرحد پار کے گلی کوچوں اور

Downloaded From Tajassus.com

منظروں سے منسوب واقعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ۔محبت جیسے آفاقی انسانی جذبے کو بھی ہمارے افسانہ نگاروں نے نئے زاویوں سے دریافت کیا پاکستانی اردو نثر کا واضح نکھار ۱۹۶۵ء کے بعد سامنے آتا ہے۔اس سال پاک بھار ت جنگ نے پاکستانی اردو کی انفرادیت کو بہت حد تک آگے بڑھانے اور کلاسیکی اردو بھی رُخ موڑنے کے لیے ایک بڑے محرک کا کردار اد ا کیا اور۱۹۸۱ء میں سقوط مشرقی پاکستان کے بعد تو پاکستانی اردو نے نئے سمتوں کا واضح تعین کرلیا ۔ اردو افسانے میں اس امر کا واضح طور پر مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ قیامِ پاکستان سے لیکر پچاس(۵۰) کی دہائی تک پاکستانی افسانے میں حقیقت نگاری کا رجحان غالب رہا ۔ ساٹھ کی دہائی میں علامتی اور تجزید ی افسانے کا آغاز ہوا۔ انتظار حسین کا افسانہ’’آخری آدمی‘‘ اس نوعیت کی افسانہ نگاری کاسرِ آغاز ہے۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا ۱۹۷۰ء کی دہائی میں علامتی تجریدی افسانے ہیں قومی شناخت، سیاسی جبریت اور معاشرتی گھٹن جیسے واقعات کو فوقیت حاصل رہی تاہم اس کے ساتھ ساتھ رومانی ، سماجی اور تہذیبی مسائل پر بھی افسانے لکھے جاتے رہے۔ ۱۹۷۷ء کے بعد پاکستانی افسانہ نگاروں کے لہجوں پر اداسی ، مایوسی اشتعال اور ہیجان انگیزی کا غلبہ رہا۔ ہمارے افسانے میں نئی نئی علامتیں ظہور پزیر ہوئیں اور طرح طرح کے اسالیب بھی متعارف ہوئے۔ پاکستانی افسانہ جس حیرت انگیز طریقے سے اپنی صنفی ورود میں مقید رہنے کے باوجود زندگی کے بدلتے تناظر ات اور پیچیدہ تجربات کی موثر صورت گری کرتا رہا ہے۔ اس سے اس کے اندر مضمر وسیع تخلیقی احکامات سے اندازہ لگانا مشکل نہیں ۔ اب پاکستانی ادب میں افسانہ ایک مضبوط روایت کا درجہ حاصل کر چکاہے۔

پاکستانی افسانہ کی مانند ناول میں موضوعات اور اسالیب کا تنوع نہیں ہے۔ فسادات کے موضوع پر فنی حوالے سے پاکستانی ناول میں بلند تخلیق سامنے نہیں آئی ا س موضوع کو محیط تمام ناول ہنگامی اور وقتی اد ب کے زمرے میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ البتہ ہجرت کے موضوع کو تخلیقی تجربہ بنانے والے کچھ ناول نگار فنی لحاظ سے کامیاب رہے ہیں۔

ANS 05

تدریسی اصولوں کا موثراستعمال:۔تدریس ایک پیشہ ہی نہیں بلکہ ایک فن ہے۔ پیشہ وارانہ تدریسی فرائض کی انجام دہی کے لئے استاد کا فن تدریس کے

Downloaded From Tajassus.com

اصول و ضوابط سے کم حقہ واقف ہوناضروری ہے۔ ایک باکمال استاد موضوع کو معیاری انداز میں طلبہ کے ذہنی اور نفسیاتی تقاضوں کے عین مطابق پیش کرنے کے فن سے آگاہ ہوتا ہے۔ معیاری اور نفسیاتی انداز میں نفس مضمون کو پیش کر نا ہی تدریس ہے۔ موثر تدریس کے لئے ،کسی بھی موضوع کی تدریس سیقبل، استاد کا موضوع سے متعلق اپنی سابقہ معلومات کا تشفی بخش اعادہ ا ور جائزہ بے حد ضروری ہے۔ سابقہ معلومات کے اعادہ و جائزہ کے علاوہ موضوع سے متعلق جدید تحقیقات و رجحانات سے لیس ہوکر اساتذہ اپنی شخصیت کو باکمال اور تدریس کو بااثر بنا سکتے ہیں۔ موثر تدریس کی انجام دہی کے لئے اساتذہ کا تدریسی مقاصد سے آگاہ ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔تدریسی اصولوں پر عمل پیرائی کے ذریعے اساتذہ مقاصد تعلیم کی جانب کامیاب پیش رفت کر سکتے ہیں۔ موثر تدریس اورتعلیمی مقاصد کے حصول میں تدریسی اصول نمایا ں کردار ادا کرتے ہیں۔تدریسی اصولوں سے اساتذہ کیوں، کب اور کیسے پڑھانے کا فن سیکھتے ہیں۔تدریسیاصولوں کا علم اساتذہ کو تدریسی لائحہ عمل کی ترتیب اور منظم منصوبہ بندی کا عادی بناتا ہے۔کیوں، کب ، اورکیسے پڑھا نے کااصو ل اساتذہ کی مسلسل رہنمائی کے علاوہ تدریسی باریکیوں کی جانکاری بھی فراہم کرتا ہے ۔ تدریسی اصولو ں پر عمل کرتے ہوئے اساتذہ موثر اور عملی تدریس کو ممکن بناسکتے ہیں۔تدریسی اصول بامقصد تدریس،نئے تعلیمی رجحانات ، تجزیہ و تنقید، مطالعہ و مشاہدہ ،شعور اور دلچسپی کو فروغ دیتے ہیں۔ تدریسی اصولوں پر قائم تعلیمی نظام نتیجہ خیز اور ثمر آورثابت ہوتا ہے۔ تدریسی اصولوں پرکاربند استا د معلم سے زیادہ، ایک رہنما اور رہبرکے فرائض انجام دیتاہے۔ جدید تعلیمینظریات کی روشنی میں استاد ایک مدرس اور معلم ہی نہیں بلکہ ایک رہبر اور رہنما بھی ہوتا ہے۔ اسلامی تعلیمات سے عدم آگہی کی وجہ سے ہم اس نظریہ تعلیم کو جدیدیت سے تعبیر کر رہے ہیں جب کہ یہ ایک قدیم اسلامی تعلیمی نظریہ ہے جہا ں استاد کو معلومات کی منتقلی کے ایک وسیلے کی شکل میں نہیں بلکہ ایک مونس مشفق مربی رہنما اور رہبر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ تدریسی اصولوں سے باخبر استاد بنیادی تدریسی و نفسیاتی اصولوں کی یکجائی سے تعلیم و اکتساب کو طلبہ مرکوز بنادیتا ہے۔ذیل میں اہمیت کے حامل چند نمایاں تدریسی اصولوں کو بیان کیا جارہاہے ۔

(1) ترغیب و محرکہ تدریسی اصولوں میں اساسی حیثیت کا حامل ہے۔طلبہ میں

Downloaded From Tajassus.com

تحریک و ترغیب پیدا کیئے بغیر موثر تدریس کو انجام نہیں دیا جاسکتا۔ طلبہ میں اکتسابی میلان ترغیب و تحریک کے مرہون منت جاگزیں ہوتاہے۔ حصول علم، پائیدار اکتساب اور علم سے کسب فیض حاصل کرنے کے لئے طلبہمیں دلچسپی اور تحریک پیدا کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔فعال و ثمر آور اکتساب ترغیب و تحریک کے زیر اثر ہی ممکن ہے۔تدریس میں ہر مقام پر طلبہ میں محرکہ کا مطالبہ کرتی ہے۔ بغیر محرکہ پیدا کیئے کامیاب اکتساب ممکن ہی نہیں ہے۔اکتسابی دلچسپیوں کی برقراری کے لئے محرکہ بہت اہم ہے۔محرکہ کی وجہ سے طلبہ میں اکتساب کی تمنا انگڑائی لیتی ہے۔

(2)درس و تدریس استاد اور طالب علم پر مبنی ایک دوطرفہ عمل ہے۔موثر تدریس اور کامیاب اکتساب کے لئے تعلیمی عمل میں استاد اور شاگرد دونوں کی سرگرم شرکت لازمی تصور کی جاتی ہے۔تعلیمی سرگرمیوں کے بغیر تدریسی عمل بے کیف اور عدم دلچسپ بن جاتا ہے۔طلبہ میں اکتسابی دلچسپی کی نمو ،فروغ اور برقراری میں تعلیمی سرگرمیاں بہت اہم ہوتی ہیں۔ کامیاب اکتساب اور موثر تدریس میں محرکہ کے بعد سب سے نمایاں مقام سرگرمیوں پر مبنی تدریس و اکتساب (Activity Based Teaching)کو حاصل ہے۔ سرگرمیوں پر مبنیتدریس طلبہ میں تعلیم سے دلچسپی ،شوق و ذوق پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔سرگرمیوں کے زیر اثر طلبہ میں نصابی مہارتیں فروغ پانے لگتی ہیں۔سرگرمیوں کے زیر اثر انجام پانے والی تدریس اور اکتساب موثر اور پائیدار واقع ہوتے ہیں۔سرگرمیوں کے ذریعے طلبہ میں عملی اکتساب (Practical Learning)فروغ پاتی ہے۔تدریسی اصولوں میں سرگرمیوں پر مبنی تدریس کو بہت اہمیت حاصل ہے اسی لئے اساتذہ اپنی تدریس کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے سرگرمیوں(activities)کو اپنی تدریس کا لازمی جزو بنا لیں۔

(3)دوران تدریس استاد جو حکمت عملی اختیار کرتا ہے اسے تدریسی حکمت عملی یا طریقہ تدریس کہتے ہیں۔تدریسی طریقہ کار معلومات کی منتقلی اورطلبہ میں علم سے محبت و دلچسپی پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ تدریس دراصل معلومات کی منتقلی کا نام نہیں ہے بلکہ طلبہ میں ذوق و شوق کو پیدا کرنے کا نام ہے۔ طلبہ میں علم کا ذوق و شو ق اگر پیدا کردیا جائے تب اپنی منزلیں وہ خود تلاش کرلیتے ہیں۔ایک کامیاب استاد اپنے طریقہ تدریس سے طلبہ میں معلومات کی منتقلی سے زیادہ شوق و ذوق کی بیداری کو اہمیت دیتا

Downloaded From Tajassus.com

ہے۔وہ تدریسی حکمت عملی اور طریقہ کار کامیاب کہلاتا ہے جو بچوں میں اکتساب کی دلچسپی کو برقرار رکھے ۔اساتذہ طلبہ میں اکتسابی دلچسپی کی برقراری کے لئے تدریسی معاون اشیاء(چارٹ،نقشے،خاکے،تصاویر،قصے ،کہانیوں،دلچسپ مکالموں اور فقروں) کو اپنی تدریسی حکمت عملی میں شامل رکھیں۔

(4)اختیار کردہ تعلیمی پروگرام اور سرگرمیوں کے پہلے سے طئے شدہ مقاصد ہونے چاہیئے۔ اور ان مقاصد کے حصول کے لئے مناسب لائحہ عمل کے تحت اساتذہ کو تعلیمی سرگرمیوں کو منتخب کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔مبنی بر مقاصد تعلیمی سرگرمیاں تعلیمی اقدار کی سربلندی اور بامعنی اکتساب میں بہت معاون ہوتی ہیں۔تعلیمی سرگرمیاں تعلیمی مقاصد سے مربوط ہونی چاہیئے۔ورنہ تعلیمی مقاصد کا حصول اور بامقصد اکتساب دونوں بھی ناممکن ہوجاتے ہیں۔

(5)اساتذہ تدریسی تنوع کے لئے جہاں مختلف سرگرمیوں سے کام لیتے ہیں وہیں تدریس کے دوران انھیں ایک بات کا خاص خیال رکھنے کی ضرورت ہو تی ہے اور یہ توجہ تدریس کا سب سے اہم اصول ہے اور وہ ہے بچہ کی انفرادیت کا احترام ۔ بچے کی انفرادیت اور اس کی شخصیت کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر اساتذہ کو تدریسی خدمات انجام دینی چاہیئے۔دوران تدریس بچے کی انفرادیت اور اس کے اکتسابی تنوع (Learning Diversities)کا خاص خیال رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔کیونکہ ہر بچے کی ذہنی صلاحیت ، ذہانت ، جذباتیت، احساس دلچسپی اور ضروریا ت میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ان تمام امور کو مد نظر رکھتے ہوئے اساتذہ کو تدریسی فرائض انجام دینا ضروری ہوتا ہے۔اساتذہ جب طلبہ کی شخصیت اور انفرادیت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں تب استاد اور شاگرد میں ایک اٹوٹ وابستگی پیدا ہوجاتی ہے اور کند ذہن سے کند ذہن طالب علم بھی تعلیم میں دلچسپی لینے لگتا ہے ۔طلبہ کی انفرادیت اور اکتسابی تنوع کا خیال رکھنے سے ایک بہت ہی خوش گوار تدریسی اور اکتسابی فضا جنم لیتی ہے۔اور اس فضاء میں ہر بچہ خود کو نہایت اہم اور خاص تصور کرنے لگتا ہے۔ تعلیمی و تدریسی حکمت عملی اختیار کرتے وقت اساتذہ طلبہ کے تنوع اور انفرادیت کا بطور خاص خیال رکھیں ۔

(6)موثر تدریس ،بہتر اکتساب اور طلبہ میں تخلیقیت اور اختراعی صلاحیتوں کی نمو و فروغ کے لئے اساتذہ تخلیقی اور اختراعی طریقہ ہائے تدریس کو بروئے

Downloaded From Tajassus.com

کار لائیں۔ طلبہ میں ہر قسم کی تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھانا ضروری ہوتا ہے اور تخلیقی تدریس اس اہم کام کی تکمیل میں ایک اہم عنصر تصور کی جاتی ہے۔تخلیقی صلاحیتوں کو فروغ دینے والی تدریسی اقداربامقصد اور ثمر آور اکتساب میں کلیدی کردار انجام دیتے ہیں۔ سابقہ معلومات کا موجودہ علم سے ارتباط،نامعلوم کو معلوم سے مربوط کرنا،معلومات زندگی کو عملی زندگی سے جوڑنا ہی علم ارتباط (principal of correlation)کہلاتا ہے۔علم ارتباط کو فن تدریس میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے جس کی بغیر علم بے مقصد اور فضول شئے بن جاتا ہے۔علم ارتباط کے ذریعہ معلومات ،دانشوری میں تبدیل ہوجاتے ہیں اور علم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے طلبہ کے ذہنوں میں محفوظ ہوجاتا ہے۔ علم ارتباط کی وجہ سے معلومات(علم) نہ صرف محفوظ ہوجاتے ہیں بلکہ وقت ضرورت معلومات کو بازیاب (Retention and Retreival)کرنے کی صلاحیت میں بھی اضافہ ہوجاتا ہے۔ تدریس کو معقول موثر اور طلبہ کے لئے دلچسپ بنانے کے لئے اساتذہ ، بہتر سے بہتر طریقہ تدریس(Teaching methods)،تدریسی حکمت عملی(teaching strategies)،تعلیمی معاون اشیاء (Teadching aids)اور دیگر وسائل کا بر موقع استعمال کرنے میں غایت درجہ کی احتیاط سے کام لیں۔موثر تدریس مناسب طریقہ تدریس کے انتخاب کا دوسرا نام ہے۔ اسی لئے اساتذہ کمرۂ جماعت ،طلبہ کی استعداد، اور ذہنی تنوع کو مد نظر رکھتے ہوئے تدریسی طریقوں کا انتخاب کریں ۔

Downloaded From Tajassus.com